مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی یاد میں

خورشید احمد

سرود رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء ـــــ میں اسلام آباد میں 'انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز' میں اپنے دفتر میں کام میں مصروف تھا کہ برادرم راؤ محمد اختر نے یہ افسوس ناک خبر سنائی: "مولانا امین احسن اصلاحی کا انتقال ہو گیا" ـــــ انا للہ وانا الیہ راجعون! میرے قلب کی گہرائیوں میں ایک طوفان سا برپا ہو گیا اور زبان سے بے ساختہ وہی الفاظ نکلے جن سے امام عصر تقی الدین ابن تیمیہؒ کے انتقال پر قاہرہ سے دمشق تک در و دیوار گونج اٹھے تھے ـــــ صلوا علی ترجمان القرآن' آؤ اس دور کے قرآن کے ترجمان کے لیے نماز مغفرت ادا کریں۔

مولانا امین احسن اصلاحی سے میرا تعارف ۵۰-۱۹۴۹ء میں ہوا۔ پہلے ان کی کتابوں سے اور پھر خود ان سے (۱۹۵۰ء میں ان کی رہائی کے بعد) کہ اس زمانے میں وہ تحریک اسلامی کے دوسرے قائدین کے ساتھ نظام اسلامی کے مطالبے کی پاداش میں جیل میں تھے۔ میں نیا نیا تحریک اسلامی سے متعارف ہوا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نام سے تو بچپن سے واقف تھا کہ والد محترم ان کے بہت پرانے دوستوں میں سے تھے اور خود مجھے اپنے بچپن میں ان کی زیارت کرنے اور ان کو ایک قومی نظم سنانے کا شرف حاصل تھا اور پھر مارچ ۱۹۴۸ء میں ان کی گرفتاری سے قبل ان کے پیچھے خود اپنے گھر میں (مسلم ٹاؤن لاہور' جہاں وقتی طور پر ہجرت کے بعد ہمارا خاندان مقیم تھا) نماز مغرب ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو چکی تھی' لیکن اس وقت تک ان کے رفقا اور پیغام سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ ان سے نیا رشتہ اس وقت جڑا جب میں اسلامی جمعیت طلبہ کی طرف کھنچا۔ خطبات اور تنقیحات نے دل و دماغ میں ایک ہلچل پیدا کر دی۔

روایتی مذہب کے مقابلے میں دین کے اس انقلابی پیغام نے میرے قلب و نظر کو ایک بالکل نئے وژن سے روشناس کیا اور جمعیت کی معیت میں ایک نئی زندگی کی تعمیر کے خواب نے خون کو گرمانے، اور خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہنے کا داعیہ دیا۔ نئے نمازی کی طرح ہر دوسری چیز کے مقابلے میں اب تحریک اسلامی کے لٹریچر میں انہماک تھا اور ایک کے بعد دوسری کتاب کی تلاش! جمعیت کی لائبریری میں جتنی کتابیں تھیں سب ہی کو چاٹ ڈالا۔ ترجمان القرآن، چراغ راہ اور کوثر اوڑھنا بچھونا ہو گئے۔ نئے شماروں کا انتظار ہی نہیں، پرانے پرچوں کی تلاش اور ان کے حرف حرف کا مطالعہ پسندیدہ مشغلہ بن گیا۔ اللہ کی رحمتیں ہوں چودھری غلام محمد مرحوم (ف جنوری ۱۹۷۰) پر کہ انھوں نے اپنے ذاتی کتب خانے تک میرے لیے رسائی آسان بنا دی اور جمعیت کے پروگراموں کے لیے تیاری نے شوق پر ذمہ داری کی سان چڑھا دی۔

یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا مودودی کی کتب کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریروں تک رسائی ہوئی۔ سب سے پہلے، حقیقت شرک پڑھی جس نے روایتی مذہبیت کے بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ مغرب کے مذہبی مفروضوں پر ضرب لگائی۔ شرک سے توحید کے سفر کی جو تاریخ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا اور گولڈن بوہ (Golden Bough) میں پڑھی تھی اس کی دھجیاں اڑ گئیں۔ سفر ہدایت کے آغاز کو توحید اور خوف کے مقابلہ میں نعمت اور ایک منعم کے قرآنی تصور کی شکل میں محکم دلائل اور مسحور کن انداز بیان کے ذریعے سمجھنے کا موقع ملا۔ حقیقت توحید اور حقیقت تقویٰ کا مطالعہ کیا اور دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات میں شامل مولانا اصلاحی کی تقریر کو بار بار پڑھا اور اس سے صبر و استقامت اور دعوت و شہادت حق کے مفہوم کو نہ صرف سمجھا بلکہ حرز جان کیا۔ مولانا اصلاحی کے یہ الفاظ تو بس دل میں اتر گئے اور آج تک مصیبت کے ہر لمحے اور آزمایش کی ہر گھڑی میں عزم و ہمت اور شوق و جذبہ کا نوشتہ بن کر آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں:

> ابھی یہ تحریک کمزور اور ضعیف ہے۔ لیکن اگر کچھ ذرے اکٹھے ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان ذروں میں کبھی گرمی اور حرارت پیدا کی اور ان میں کچھ صلاحیت پیدا ہو گئی، تو کیا عجب ہے کہ اس کمزور گروہ کے ہاتھوں دین کی وہ خدمت انجام پائے جو اللہ کو، اس کے رسولؐ کو اور تمام مومنین کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اللہ ہمیں اس کام کے لیے سچا خادم بنا دے۔

کوئی جماعت نہ تھی جو اس مقصد خاص کے لیے جدوجہد کر رہی ہو، باطل سے باطل مقاصد کے لیے جماعتیں ہوں، ان کے لیے بڑی بڑی قربانیاں کرنے والے ہوں، لیکن اس آسمان کے نیچے جو سب سے بڑا مقصد ہو، اسی کے لیے کچھ نہ ہو، کس قدر غم انگیز بات ہے۔ اس مقصد کے لیے کچھ خدا کے بندے اکٹھے ہو گئے، سمجھانے اور سمجھنے میں ذرا دیر لگے گی مگر دنیا سمجھے گی ضرور۔ اور اگر نیتوں میں خلوص ہے تو جس وقت شیطان اپنی فوج لے کر نکلے گا تو ہم اس مبارک ذات کے اسوہ کی پیروی کریں

گے جس نے ہزاروں غرق آہن جنگجوؤں کے سامنے تین سو تیرہ بے سروسامان لا کھڑے کیے تھے اور اللہ تعالیٰ نے انھی کے ذریعہ سے حق کا بول بالا کیا تھا۔

پھر اگر اس جدوجہد میں بازی پالی تو فھو المراد، اور اگر دوسری بات ہوئی تب بھی تمام راستوں میں ایک حق ہی کا راستہ ایسا راستہ ہے جس میں ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔ اس میں اول قدم بھی منزل ہے، اور آخر بھی، ناکامی کا اس میں گزر ہی نہیں ہے۔ اس کو مان لینے اور اس پر چلنے کا عزم راسخ کر لینے کی ضرورت ہے۔ پھر اگر تیز سواری مل گئی تو نعما، یہ نہ سہی تو چھکڑے ملیں گے، انھیں سے سفر ہو گا، یہ بھی نہیں تو دو پاؤں موجود ہیں، ان سے چلیں گے، پاؤں بھی نہ رہیں تو آنکھیں تو ہیں، ان سے نشان منزل دیکھیں گے، آنکھیں بھی اگر بے نور ہو جائیں تو دل کی آنکھ تو ہے، جس کی بصارت کو کوئی سلب نہیں کر سکتا بشرطیکہ ایمان موجود ہو۔ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ میری زندگی کے رخ کو متعین کرنے میں مولانا اصلاحی صاحب کے ان الفاظ کا بڑا دخل ہے۔ یہیں سے تحریک پا کر ہم نے جمعیت کے دستور میں حلف رکنیت کے لیے جس آیت کا انتخاب کیا وہ یہی آیت تھی، یعنی اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ....)۔ آج تقریباً پچاس سال کے بعد خود مولانا اصلاحی کی زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے جس بات کا انھوں نے مندرجہ بالا الفاظ میں اظہار کیا تھا اور ہم سب کو اس پر کاربند ہونے کی دعوت دی تھی انھوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ وہ اپنے رب سے اس حال میں ملے کہ سواری پر بھی سفر کیا، چھکڑے پر بھی، جماعت میں رہ کر بھی یہی جدوجہد کی اور جماعت کو چھوڑنے کے بعد بھی، اس راہ پر قدموں سے بھی چلے اور جب صاحب فراش ہو گئے تو آنکھوں کا مرکز و محور اسی کو رکھا اور بالآخر دل کی آنکھ سے اسی روشنی کا طواف کرتے رہے، تاآنکہ اپنے رفیق اعلیٰ کی طرف عازم سفر ہو گئے۔ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاھَدُوا اللّٰہَ عَلَیْہِ (الاحزاب ۳۳:۲۳)، "(بلاشبہ) ایمان لانے میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا"۔ بقول حافظ ؎

دست از طلب ندارم، تا کارِ من بر آید
یا تن رسد بہ جاناں، یا جاں ز تن بر آید

میں دست طلب نہیں ہٹاتا تاآں کہ میرا مقصد پورا نہ ہو جائے [اور وہ مقصد یہ ہے کہ] یا وصال یار ہو جائے، میرا جسم محبوب سے مل جائے یا جسم سے روح نکل جائے۔

تحریک اسلامی میں مولانا مودودی کے بعد جس ہستی نے ہمارے فکر و نظر اور سیرت و کردار کی تعمیر میں سب سے موثر اور فیصلہ کن رول ادا کیا وہ مولانا امین احسن اصلاحی ہی تھے۔ میرے لیے وہ ہمیشہ ایک عظیم

محسن، مربی، استاد، مرشد اور راہنما رہے۔ میرے لیے ہی نہیں تحریک اسلامی کی تین نسلوں کے لیے! تاریخ میں ان کا شمار بیسویں صدی کے اسلامی احیائی فکر کے کلیدی معماروں میں ہو گا۔ افسوس کہ اس سلسلتہ الذھب کی وہ آخری کڑی تھے۔ ان کے انتقال سے بیسویں صدی کے اختتام سے تین سال قبل یہ آخری چراغ گل ہو گیا جو بہت بڑی محرومی ہے، لیکن امر ربی کے آگے سر تسلیم خم ہے۔ البتہ یہ یقین اور اطمینان ہے کہ الحمدللہ اس صدی کے اسلامی مفکرین نے اور خصوصیت سے علامہ اقبال، مولانا مودودی، حسن البنا شہید، علامہ حمید الدین فراہی، سید قطب، مالک بن نبی اور مولانا اصلاحی رحمہم اللہ اجمعین نے فکر و عمل کی ایسی شمعیں روشن کر دی ہیں اور ان کے افکار اور دعوت کے زیر اثر پوری دنیا میں ایسی علمی اور عملی اصلاحی تحریکیں برپا ہو گئی ہیں کہ اکیسویں صدی کا آغاز تاریکی میں نہیں روشنی میں ہو رہا ہے۔ ان بزرگوں کا یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں۔ ان کی روحیں سرگوشیاں کر رہی ہیں کہ ۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں، اجالا ہے

مولانا امین احسن اصلاحی ۱۹۰۴ء میں یوپی (بھارت) میں اعظم گڑھ سے کوئی چار میل دور دریائے ٹونس کے کنارے واقع ایک گاؤں "بمہور" میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق وہاں کے ایک متوسط دینی راجپوت زمیندار گھرانے سے تھا۔ اس گاؤں کی بھی ایک تاریخ ہے۔ یہ ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا مرکز رہ چکا ہے۔ انگریزی استبداد کے خلاف جو عوامی تحریک اٹھی، یہ گاؤں اس کا ایک گہوارہ تھا اور انگریز دشمنی یہاں کی فضا اور پانی کا ایک حصہ تھی جسے نومولود امین احسن نے شیر مادر سے حاصل کیا۔ علامہ شبلی نعمانی کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا یعنی اعظم گڑھ اور انھی کی کوشش سے یہ ضلع (اعظم گڑھ) ان کی علمی اور تحقیقی سرگرمیوں کا مرکز بنا۔ ایک قصبے سرائے میر میں ایک مدرسہ "مدرستہ الاصلاح" کے نام سے ۱۹۱۱ء میں قائم ہوا جس نے تحریک اسلامی کی تاریخ میں بڑا منفرد کردار ادا کیا۔ روایت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی جب علی گڑھ دیوبند اور حتیٰ کہ ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ان مقاصد کے حصول کے باب میں مایوس ہوئے جو اسلام کی نشات ثانیہ کے سلسلے میں ان کے پیش نظر تھے تو پھر ایک طرف انھوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ پر توجہ دی تو دوسری طرف مدرستہ الاصلاح قائم کیا جس کا مقصد ایسے نوجوان تیار کرنا تھا جن میں روایتی دینداری کے مقابلے میں اسلام کا ایسا شعور پیدا کیا جا سکے جو اصلاح اور تبدیلی اور بالآخر اسلامی انقلاب کا ذریعہ بن سکے۔ اس مدرسے میں چن چن کر اچھے اساتذہ کو جمع کیا گیا۔ آخری دور میں مولانا شبلی خود اس کے صدر مدرس تھے اور انھی کی خواہش پر امین احسن جو ایک نہایت ذہین بچہ تھا دس سال کی عمر میں اس مدرسہ میں داخل ہوا۔

دراصل علامہ شبلی کے تعلقات اصلاحی صاحب کے والد جناب حافظ مرتضیٰ احمد صاحب سے نہایت گہرے اور مخلصانہ تھے۔ کم سن امین احسن کے دادا کی خواہش تھی کہ زمیندار کا یہ لڑکا بڑا ہو کر ضلع کچہری میں ملازمت کرے لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کی مشیت یہ نہ تھی کہ یہ بچہ برطانوی سامراج کے نظام کا کل پرزہ بنے، بلکہ اس کا مقدر تو پورے نظام کے خلاف ایک تیغ براں بننا تھا۔ دادا کی خواہش کے برعکس علامہ شبلی کی تحریک پر حافظ مرتضیٰ احمد نے، گاؤں کی ابتدائی تعلیم کے بعد امین احسن کو مدرسۃ الاصلاح کے سپرد کر دیا جہاں تیسرے درجہ میں ان کا داخلہ ہوا۔ اس مدرسہ کے نظم و نسق اور نصاب تعلیم وغیرہ کی نگرانی علامہ شبلی نعمانی بطور خود کرتے تھے اور ان کے بعد ان کے عزیز مولانا حمید الدین فراہی کرتے رہے، گو وہ حیدر آباد میں دارالعلوم کے پرنسپل تھے (جہاں ان سے مستقبل میں تاریخ کے رخ کو موڑنے والے ایک اور ذہین بچہ ابوالاعلیٰ مودودی استفادہ کر رہا تھا اور عربی زبان و ادب اور قرآن فہمی کی ابتدائی منزلیں طے کر رہا تھا)۔ لیکن شبلی نعمانی کے بعد اس مدرسہ کے وہی نگران تھے اور اپنی زندگی کے آخری پانچ سال یعنی ۱۹۲۵ سے ۱۹۳۰ تک علامہ فراہی نے ہمہ وقت اس مدرسہ میں گزارے۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں نوجوان امین احسن اصلاحی نے ان کے شاگرد خاص کی حیثیت سے شب و روز ان کی معیت میں گزارے اور ان کے علم اور طرز فکر کے وارث بنے۔ (مولانا امین احسن صاحب کے علاوہ مولانا اختر احسن اصلاحی فراہی صاحب کے دوسرے شاگرد خاص اور علم و فکر کے امین تھے جو ان کے بعد مدرسۃ الاصلاح کے ذمہ دار بنے)۔

مدرسۃ الاصلاح میں مولانا امین احسن کو مولانا عبدالرحمٰن نگرامی جیسا استاد اور اتالیق میسر آیا جس نے ان کی علمی اور اخلاقی تربیت کی۔ علوم اسلامی اور اجتماعی کے علاوہ عربی، اردو، فارسی اور انگریزی میں اتنی دسترس پیدا کی کہ آیندہ تحقیق و تدبر کی راہیں خود طے کر سکیں، زبان و ادب کا ذوق و شوق پیدا کیا، نیز ان کی تقریری صلاحیتوں کو چار چاند لگائے۔ ۱۹۲۲ میں اٹھارہ سال کی عمر میں مولانا امین احسن اصلاحی مدرسے سے فارغ ہوئے اور تین سال صحافت کی وادی میں جوہر دکھاتے رہے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں مضمون نگاری کا آغاز ہو گیا تھا۔ سہ روزہ مدینہ بجنور کے، جس کا مسلمانان ہند کی سیاسی اور ادبی تاریخ میں بڑا اونچا مقام ہے، نائب مدیر مقرر ہوئے اور غالباً دو ڈھائی سال اس سے وابستہ رہے۔ اسی زمانے میں بچوں کے ایک رسالہ "غنچہ" اور مشہور ہفت روزہ "سچ" میں بھی کام کیا۔ یہ ہفت روزہ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کی نگرانی میں شائع ہوتا تھا اور بعد میں مولانا عبدالماجد دریا بادی کی ادارت میں صدق اور پھر "صدق جدید" کی شکل میں شائع ہوتا رہا۔ کچھ عرصے کے لیے مولانا اصلاحی "الناظر" سے بھی وابستہ رہے جس کے روح رواں ملک کے دو صاحب طرز ادیب یعنی مولانا ظفر الملک علوی اور مولانا عبدالماجد دریا بادی تھے۔ اسی زمانے میں مولانا اصلاحی کے بڑے بہترین تعلقات مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریا بادی

اور مولانا منظور نعمانی سے قائم ہوئے۔

کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہے کہ اپنی اس علمی و صحافتی سیاحت کے زمانے میں مولانا امین احسن اصلاحی نے اس دور کی روایت کے مطابق کئی کتب کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کی پہلی کتاب ایک عربی ناول کا ترجمہ "ہندوستانی جاسوس" تھی۔ اس ناول میں ایک ہندوستانی جاسوس کی سرگذشت بیان کی گئی ہے جو مصطفیٰ کمال پاشا کو قتل کرنے کے لیے ترکی گیا تھا۔ ترجمہ نہایت سلیس اور انداز بیان شگفتہ ہے۔ پہلا ایڈیشن اخبار مدینہ بجنور کے مکتبہ سے شائع ہوا تھا۔ غالباً اب بھی ہندوستان میں تلاش سے مل جائے۔ اس کے علاوہ مشہور مورخ محی الدین الجیلط کی تاریخ اسلام کا بھی عربی سے اردو میں ترجمہ کیا جو تین جلدوں میں شائع ہوا۔ یہ کتاب بھی مدینہ بجنور نے شائع کی تھی۔ بعد میں مولانا فراہیؒ کی رہنمائی میں اصلاحی صاحب جس علمی اور تحقیقی، اور پھر مولانا مودودیؒ کی معیت میں دعوتی اور احیائے دین کی جدوجہد میں شریک ہوئے اس کی وجہ سے ان کی یہ ابتدائی تالیفات نظروں سے اوجھل ہو کر بس ایک قصہ پارینہ بن گئیں۔

۱۹۲۵ مولانا اصلاحی کی زندگی میں ایک فیصلہ کن موڑ ہے جب صحافت کو خیرباد کہہ کر وہ اپنے استاد اور مرشد علامہ حمید الدین فراہی کی خواہش پر ہمہ وقت مدرسۃ الاصلاح سے وابستہ ہوئے اور پھر دن رات ان کی خدمت میں رہے اور ہر لمحہ ان کے علوم و فیوض سے استفادہ کیا اور عمر و سال کے فرق کے باوجود علمی اور معنوی حیثیت سے اس طرح استفادہ کیا کہ ؎

من تو شدم تو من شدی، من تن شدم تو جان شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں، من دیگرم تو دیگری

میں نے تیرا قالب اختیار کر لیا ہے اور تو میرے قالب میں آگیا ہے۔ میں جسم ہوں، تو اس کی روح ہے۔ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہے گا کہ میں اور چیز ہوں اور تو دوسری چیز ہے۔

علامہ حمید الدین فراہی مرحوم ان نادرہ روزگار شخصیات میں سے تھے جو اگر ایک طرف اسلامی اور جدید علوم کے جامع تھے تو دوسری طرف قدرت نے انھیں اپنے فیض خاص سے نوازا تھا۔ صرف ذہن رسا ہی نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ اور فکر و تہذیب کے رخ کو موڑنے کا داعیہ بھی دیا تھا۔ ان کے اساتذہ میں علامہ شبلی نعمانی، مولانا فیض الحسن سہارنپوری (شارح حماسہ) اور مولانا فاروق چریا کوٹی جیسے فلسفی اور متکلم تھے۔ پھر علی گڑھ یونی ورسٹی میں انھوں نے جدید علوم کی تعلیم حاصل کی اور بقول مولوی عبدالحق: وہ علی گڑھ یونی ورسٹی کے ذہین ترین اور متقی ترین طالب علم تھے۔ انھوں نے اپنی محنت سے عربی، فارسی، انگریزی اور عبرانی پر ماہرانہ قدرت حاصل کی۔ ادب، فلسفہ، تاریخ اور علوم القرآن میں ان کو تخصص حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن پر غور کرنے، اس کے اسلوب کو سمجھنے اور معانی تک پہنچنے کا خاص ملکہ عطا کیا تھا۔ ان

کی تحقیق کا ایک خاص انداز تھا اور "ذبیح کون" میں اس کا ایک شان دار نمونہ پایا جاتا ہے۔ ۳۰-۳۵ سال انھوں نے صرف قرآن پر تدبر کرنے، اس کے نظم کو سمجھنے اور نظم قرآن کی چابی سے اس کے معانی کو پا جانے اور بہت سے بند قفلوں کو کھولنے میں صرف کیے۔

علامہ فراہی نے متعدد بیش قیمت رسائل لکھے (جن کا ترجمہ **مجموعہ تفاسیر فراہی** کے نام سے مولانا اصلاحی کے قلم سے شائع ہو چکا ہے) لیکن اپنے حاصل مطالعہ و تفکر کو وہ پوری طرح صفحہ قرطاس پر منتقل نہ کر سکے۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ وہ اس علم کو اپنے شاگردوں کے ذریعہ آنے والی نسلوں تک منتقل کر دیں۔ یہ سعادت مولانا امین احسن اصلاحی اور ایک حد تک الاصلاح کے پرنسپل مولانا اختر احسن اصلاحی اور دوسرے اساتذہ کو حاصل ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے فراہی صاحب کے انتقال (نومبر ۱۹۳۰) کے بعد اپنی زندگی استاد کے افکار کی حفاظت اور طباعت و اشاعت، ان کی تحریروں کے ترجمہ و تسوید اور ان کے اصول تفسیر کی روشنی میں قرآنی مطالب پر مزید غور و فکر اور ان کی تعلیم، تدریس اور تشہیر کے لیے وقف کر دی۔ **تدبر قرآن** کو گہری نظر سے پڑھنے والا ہر شخص گواہی دے گا کہ شاگرد نے استاد سے وفاداری کا حق بھی ادا کیا اور ان کے دکھائے ہوئے نشان ہائے منزل کی روشنی میں نئی راہیں تلاش کیں اور نئی رفعتیں بھی حاصل کیں۔

قرآن سے مولانا اصلاحی کا شغف والہانہ بھی تھا اور تدبرانہ بھی۔ وہ اس باثر کلام کے عاشق تھے اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی ان کا محبوب ترین مشغلہ۔ مطالعے کے معاملہ میں اصلاحی صاحب کا ایک خاص ذوق تھا۔ وہ بسیار خواندگی کے قائل نہیں تھے۔ جس طرح دوستوں کے انتخاب میں وہ selective تھے اسی طرح کتب کے انتخاب میں بھی۔ ان کی کوشش ہوتی تھی کہ بس چند بنیادی کتب کا بغور مطالعہ کر لیں اور پھر سارا وقت قرآن پر غور و تدبر کے لیے صرف کریں۔ وہ قرآن کے حافظ تو نہ تھے مگر انھوں نے اپنی زندگی اس طرح قرآن کے ساتھ گزاری کہ قرآن ان کے شب و روز کا رفیق بن گیا اور اس کے معانی و مطالب کے استحضار کی یہ کیفیت تھی کہ جب جس مسئلے پر بات کریں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک مدت سے اسی پر تحقیق کر رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جمعیت کے دور میں کئی بار ایسا ہوا کہ ہم نے ان سے درس کی درخواست کی اور انھوں نے آنکھ بند کر کے قرآن کو کھولا اور جہاں سے کھل گیا وہیں سے درس شروع کر دیا اور علم و حکمت کے موتی برسانے لگے۔ یا ہم نے ان کے اجتماع میں تشریف لانے کے بعد کسی خاص حصے کے درس کی خواہش کی تو بلاتکلف اس حصے کا درس اس طرح دیا گویا گھنٹوں بلکہ دنوں کی تیاری کے بعد درس دے رہے ہوں۔ اس طرح ۱۹۵۱ اور ۱۹۶۸ کے دوران مجھے بارہا ان کے دروس میں حاضری اور انفرادی طور پر قرآن کے بارے میں اپنے سوالات ان کی خدمت میں پیش کرنے اور ان سے رہنمائی لینے کا موقع ملا۔ اس دوران قرآن سے ان کے شغف، اس کے معانی پر ان کی گرفت اور علوم قرآنی کے ادراک اور استحضار کی جو کیفیت

میں نے دیکھی وہ بے مثال تھی۔ ویسے تو ہر وقت ہی ان کا ذہن قرآن کے رموز کو تلاش کرنے میں مصروف رہتا تھا لیکن خصوصیت سے رات کی تنہائی میں اور صبح کی ضوفشانیوں میں۔ ان کا معمول تھا کہ عشا کے بعد آرام فرماتے اور فجر سے پہلے اٹھ کر نوافل پڑھتے اور اول وقت نماز ادا کر کے ٹہلتے تھے اور انھی لمحات کو انھوں نے قرآن کے لیے خاص کر رکھا تھا۔ بلاشبہ مولانا اصلاحی کا مطالعہ بھی وسیع تھا اور ان کا حال یہ تھا کہ ۔

یوں لائے داں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر
دیکھا جہاں کہیں کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

لیکن ان کا اصل دین (contribution) قرآن پاک پر اپنے مخصوص انداز میں غور و فکر اور تدبر و تعقل ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس نے ان کی تحریر و تقریر کو ایک انفرادی شان دی۔ ان کی پوری زندگی کا محور و مرکز قرآن ہے! تدبر قرآن کے مقدمے میں اصلاحی صاحب کسی عالم جذب میں اپنی اس کیفیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ذرا دیکھیے:

میں بلا کسی شائبہ فخر کے محض بیان واقعہ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب میری چالس سال کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے اپنی جوانی کا بہترین زمانہ اس کتاب کی تیاری میں بسر کیا ہے اور اب اپنے بڑھاپے کی ناتوانیوں کا دور اس کی تحریر و تسوید میں بسر کر رہا ہوں۔ اس طویل مدت میں' میں نے زندگی کے بہت سے اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اور بہت سے تلخ و شیریں گھونٹ حلق سے اتارے ہیں لیکن اپنے رب کا شکر گزار ہوں کہ کسی دور اور کسی حال میں میرا ذہنی و قلبی تعلق اس کتاب سے منقطع نہیں ہوا۔ میں نے اس ساری مدت میں جو کچھ پڑھا ہے اس کو محور بنا کر پڑھا ہے اور جو کچھ سوچا ہے اس کو سامنے رکھ کر سوچا ہے اور جو کچھ لکھا ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی سے متعلق لکھا ہے۔ میں نے قرآن حکیم کی ایک ایک سورت پر ڈیرے ڈالے ہیں۔ ایک ایک آیت پر فکری مراقبہ کیا ہے۔ اور ایک ایک لفظ اور ایک، ایک ادبی اور نحوی اشکال کے حل کے لیے ہر اس پتھر کو الٹنے کی کوشش کی ہے جن کے نیچے مجھے کسی سراغ کے ملنے کی توقع تھی۔ اور یہ راز بھی برملا ظاہر کرتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی اس کام میں کوئی تکان یا افسردگی محسوس نہیں کی بلکہ ہمیشہ گہری لذت اور نہایت عمیق راحت کا احساس کیا ہے۔ (تدبر قرآن' ج ۱' ص ۴۱) ؎

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(اسے) ہر لمحے غیب سے' ایک نئی زندگی عطا ہوتی ہے

مولانا اصلاحی کے تفسیری کارنامے کا سب سے اہم پہلو قرآن کی تفسیر قرآن سے' اور اس کے معانی کو اس کتاب کے اندرونی ربط اور الفاظ کے معنی کی صحیح تفہیم کے ذریعے متعین کرنا ہے۔ قرآن فہمی کے بیرونی ذرائع سے بھی انھوں نے کماحقہ استفادہ کیا ہے لیکن ان کی منفرد خدمت اس کے اندرونی ذرائع سے بھرپور

استفادہ اور ان کی روشنی میں بات کو اس طرح پیش کرنا کہ قرآن خود بولتا ہوا نظر آتا ہے۔ تدبر قرآن کی ایک منفرد خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایک آیت کا ایک ہی مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے خود اعتراف کیا ہے کہ "اس تفسیر میں چونکہ میں نے نظم کلام کو پوری اہمیت دی ہے اس وجہ سے ہر جگہ میں نے ایک ہی قول اختیار کیا ہے بلکہ اگر اس حقیقت کو صحیح لفظوں میں بیان کروں تو مجھے یوں کہنا چاہیے کہ مجھے ایک ہی قول اختیار کرنے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ نظم کی رعایت کے بعد مختلف وادیوں میں گردش کرنے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہ جاتا"۔ اسی طرح بہت سے فقہی اختلافات کی جڑ بھی صاحب تدبر قرآن کی نگاہ میں آیات کو ان کے سیاق و سباق اور مجموعی نظم سے علیحدہ کرکے سمجھنے میں ہے۔ لیکن اگر ہر آیت کا ایک مفہوم متعین ہو جائے تو ان کی نگاہ میں اس سے فقہی اختلافات کو کم کرنے اور امت میں ایک اجتماعیت قائم کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔

تفسیر میں لغت کی اہمیت کو تو ہر مفسر نے مانا ہے لیکن مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کے یہاں نزول قرآن کے زمانے کی عربی زبان اور ادب کو جو اہمیت حاصل ہے' وہ منفرد ہے۔ دور جدید کے مفسرین میں علامہ محمد اسعد (لیوپولڈ ویس) نے بھی اس کو خصوصی اہمیت دی ہے۔

مولانا فراہی اور مولانا اصلاحی کی فکر میں نظم کی اہمیت بجا' لیکن اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس کا تعلق صرف طرز فکر اور اسلوب تفسیر سے ہے۔ دونوں کے افکار اور خصوصیت سے ان کے قرآن کے مطالب و معانی کی تشریح کا جو سب سے اہم پہلو ہے وہ قرآن کے پوری انسانیت کے لیے کتاب ہدایت ہونے' اہل ایمان کے لیے ایک مکمل نظام زندگی اور تہذیب و تمدن کا کامل نقشہ فراہم کرنے' فرد اور معاشرے کی تربیت و تزکیہ کے لیے ایک خود کفیل پروگرام دینے' اور دین حق کے قیام اور اسلامی نظام کو عملاً نافذ کرنے کے لیے امت کے لیے ایک واضح منہج کے تعین سے ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے بیسویں صدی میں اسلام کی احیائی فکر کا حاصل اور خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔

قرآن کے اعجاز کے بے شمار پہلو ہیں اور ہر دور میں ان کو نمایاں کرنے کی کوششیں اہل علم نے کی ہیں۔ مولانا فراہی' مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی نیز عرب دنیا میں سید قطب شہید کی قرآنی خدمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بزرگ نے اپنے اپنے انداز میں اپنے دور کے انسان کا رشتہ اللہ کی کتاب سے جوڑنے اور قرآنی ہدایت کی روشنی میں عصر حاضر کے مسائل کے حل کی راہیں استوار کرنے کے لیے بڑی واضح رہنمائی دی ہے۔ البتہ جو چیز ان چاروں مفکرین کے سوچنے کے انداز اور اسلوب تفسیر میں نمایاں ہے وہ قرآن کے مرکزی موضوع کی تلاش اور اس کے اس پیغام اور محور سے اس کی تمام تعلیمات' احکام' امثال' تاریخی نظائر' انفس و آفاق کی آیات اور دنیا اور آخرت کے احوال کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش ہے۔ ان بزرگوں نے ماضی کے کام کی عظمت اور افادیت کا پورا پورا لحاظ رکھتے ہوئے

قرآن کو خود قرآن کے ذریعے سمجھنے اور قرآن کے پیغام کی روشنی میں انسانیت کی تعمیر نو کا وژن دیا ہے۔ اگر مولانا مودودیؒ کا مخاطب حق کا ایک عام متلاشی اور امت مسلمہ کی وہ سعید روحیں ہیں جو قرآن کی دعوت کی علم بردار بن کر اس کتاب کے مشن اور احکام کی اقامت کا جذبہ اور داعیہ رکھتی ہیں تو مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحیؒ نے اپنی توجہ کا مرکز ان اہل علم کو بنایا جو قرآن کا تدبر کی نگاہ سے مطالعہ کر سکیں اور امت اور انسانیت کی علمی قیادت و رہنمائی کا فریضہ انجام دے سکیں۔ سید قطب کے سامنے بھی یہی ہدف نظر آتا ہے۔ البتہ انھوں نے عربی زبان کے آہنگ نیز عرب قوم اور اس کے مزاج اور ثقافتی روایت کی روشنی میں بیان کا وہ انداز اختیار کیا جس میں فکر کی سلاست کے ساتھ جذبات کی تہذیب اور انگیخت کا پورا پورا سامان ہو اور ان دونوں قوتوں کے ذریعے وہ قاری کو اس مشن کی خدمت میں سرگرم کر سکیں۔ نیز ان کے اسلوب کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ فی ظلال القرآن کا لکھنے اور پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے محسوس کرتا ہے کہ جیسے بندہ اپنے محبوب کے خط کو پڑھ رہا ہو اور اس کے حسن پر فریفتہ اور اس کے جاں فزا پیغام پر مسحور ہو۔

ان بزرگوں کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پر غور و فکر اور اس کی روشنی میں زندگی کی راہیں استوار کرنے کے لیے نہ صرف یہ کہ واضح اصول مرتب کیے جو عصر حاضر میں قرآن فہمی کے لیے باب کشا ہیں بلکہ انگلی پکڑ کر قرآن کے طالب علم کی راہنمائی ان خطوط کی طرف کر دی جن کے ذریعے ایک طرف آج کا انسان قرآن کے جوہر کو پالے تو دوسری طرف قرآن کی عظمت اور انسان ساز اور تاریخ گر قوت کے سہارے آج ہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی انسانی زندگی کی تشکیل جدید کر سکے۔

مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحیؒ کے کام کو اس سلسلے میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے جتنا بھی غور کیا، محسوس کیا کہ ان کا اصل کارنامہ ان دو نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

اولاً انھوں نے آج کے قرآن کے طالب علم کے لیے قرآن فہمی کا وہ راستہ اختیار کیا جس کے نتیجے میں قرآن کی دعوت، پیغام اور ہدایت و رہنمائی کا (contextualization) خود قرآن، الہامی ہدایت کی وسیع تر روایت، دور نزول قرآن کے زبان و ادب اور دور رسالت مآبؐ سے آج تک کے لیے سنت اور شاہراہ ہدایت کے تواتر اور فکری اور عملی تسلسل کے فریم ورک میں کیا جا سکے۔ اس طرح اس کی آفاقیت اور ابدیت کے وہ پہلو نمایاں ہوئے جو اللہ کی کتاب کو کسی خاص عہد کے احوال و ظروف کے مقابلے میں انسانیت کی ابدی ضروریات کے لیے آفتاب ہدایت بناتے ہیں۔

ثانیاً، چودہ سو سال میں جو تفسیری لٹریچر امت کے اہل علم نے تیار کیا اس کے پورے احترام اور اس سے استفادہ کرتے ہوئے دور جدید میں تفسیری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس لٹریچر سے ایک گونہ de-contextualization کی خدمت بھی انجام دی تاکہ اس ابدی ہدایت کی روشنی میں نئے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے اور اس طرح کیا جا سکے جو اصل اور اولیں contextualization سے ہم آہنگ اور

تواتر کے استقرار کا ضامن ہو۔ یہ بڑا نازک اور بڑا مشکل کام تھا اور بلاشبہ اسے اجتہادی لغزشوں سے مکمل طور پر پاک قرار نہیں دیا جا سکتا اور اختلاف کرنے والے اس پر انگشت نمائی بھی کرتے رہیں گے۔ حقیقت کا علم تو صرف اسی کو ہے جس کا یہ کلام ہے۔ لیکن ہم جیسے طالب علم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراہی صاحب اور اصلاحی صاحب کا یہ کام خود اعجاز قرآن کے ایک منفرد پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ ان بزرگوں نے یہ دونوں کام' انسانی حد تک' بڑی دقت نظر' بڑی ذمہ داری اور بڑے ادب و احترام سے انجام دیے اور قرآن کے طالب علموں کو بیسویں صدی ہی نہیں اکیسویں صدی کے مسائل اور چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لائق بنانے میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ بلاشبہ مستقبل میں بھی قرآن اپنے خزانے اسی طرح کھولتا رہے گا جس طرح ماضی میں کھولے ہیں اور حالات و ظروف کے بدلنے سے ایسے ایسے گوشے سامنے آتے رہیں گے جو پہلے گزرنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے ہیں۔ لیکن تحدیث نعمت کے لیے اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہمارے اپنے دور میں قرآن فہمی کی جو شمعیں ان بزرگوں نے روشن کی ہیں وہ راسخون فی العلم کی خدمات کی شاندار روایات کا حصہ ہیں اور بیسویں صدی کے اسلامی فکر کا روشن ترین باب۔ تفہیم القرآن' تدبر قرآن اور فی ظلال القرآن اس دور کے اسلامی لٹریچر کا ماحاصل اور ایک دوسرے کے لیے ازواج اور توام (شریک جسم بہنوں) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس صدی کے لٹریچر پر نگاہ ڈال کر دیکھتا ہوں تو دل گواہی دیتا ہے کہ اگر یہ تفاسیر نہ ہوتیں تو امت کی غربت کا کیا عالم ہوتا اور الحمدللہ ان کی وجہ سے ہم کتنی بڑی علمی دولت سے مالا مال ہو گئے ہیں۔ ذالک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء۔

اگر اسے گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو بڑے ادب اور عجز کے ساتھ اپنی اس خلش کا اظہار بھی کر دینا چاہتا ہوں کہ حدیث کی حجیت کے باب میں کسی تحفظ کے بغیر حدیث کے مقام اور استعمال' اور خصوصیت سے خبر احاد کے سلسلے مولانا اصلاحی صاحب کے موقف اور مقدمہ تدبر حدیث کے چند نازک مقامات کے بارے میں' مجھے اضطراب رہا ہے۔ نیز مسئلہ رجم کے سلسلے میں مولانا اصلاحی صاحب کے دلائل کی طرف عقل کے جھکاؤ کے باوجود دل و دماغ اسے قبول نہ کر سکے۔ لیکن یہ اور ایسے ہی چند دوسرے مقامات کے علی الرغم قرآنی فکر کی تفہیم اور اسلامی افکار و مسائل کی تشکیل جدید کے تسلسل میں مولانا اصلاحی صاحب کا بڑا حصہ ہے اور نصف صدی کا قصہ ہے' دو چار برس کی بات نہیں اور مجھے اس امر کے اظہار میں بھی قطعاً کوئی باک نہیں کہ بیسویں صدی کے اسلامی فکر کے معماروں میں سے نمایاں مفکر کی حیثیت سے مولانا اصلاحی کے اثرات تادیر قائم رہیں گے۔ (جاری)

حج مبارک

☆ آپ حج کرنے جا رہے ہیں تو آپ کے لیے

☆ حج کے لیے جانے والے اعزہ و احباب کے لیے

حج کا شوق پیدا کرنے کے لیے

خرم مراد کے تین کتابچے

1- حاجی کے نام	3.50
2- حج وداع کی داستان	7.50
3- نالہ نیم شب (21 دعائیں)	3.00

خصوصی لفافے میں تحفہ حج 14 روپے کے بجائے 10 روپے میں

منشورات منصورہ، ملتان روڈ، لاہور

فہم القرآن سیٹ

20 آڈیو کیسٹ

سورہ فاتحہ، سورہ الشمس تا سورہ الناس (آخری 24 سورتیں)

درسِ قرآن بھی، دِلوں پر دستک بھی

ترتیب و تدوین اور آواز : خرم مرادؒ

تعارفی قیمت 550 روپے

قرآن مجید کے مضامین کا خلاصہ

4 ویڈیو کیسٹ

حافظ محمد ادریس

تعارفی قیمت 900 روپے

تعمیرِ نو حرمین شریفین

2 ویڈیو کیسٹ

(انگلش)

تعارفی قیمت 350 روپے

قرآن مجید مکمل سیٹ

14- آڈیو کیسٹ

تلاوت
قاری عبدالرحمٰن السدیس
امام کعبہ
قاری سعود الشریم

تعارفی قیمت : 475 روپے

سمع و بصر علی ہاؤس 9- کمرشل زون، کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

فون : 5411546 فیکس: 5419541